Chapter - 1

باب اول

بیسویں صدی کی سماجی و تہذیبی اقدار

ہر ادیب یا فن کار کا تخلیقی عمل اس کے فکری اور شعوری رویے سے عبارت ہے اور سوجھ بوجھ، افکار اور نظریات غرضیکہ اس کی پوری دنیا خواہ کیسی بھی کیوں نہ ہو کسی نہ کسی معاشرتی اور تاریخی و تہذیبی دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ ادیب و شاعر کے فکر و شعور کی اصل بنیاد وہ اقتصادی ڈھانچہ ہوتا ہے جس سے کسی بھی معاشرتی نظام کی تشکیل ہوتی ہے اور اگر معروضی حقیقتوں کو جمالیاتی سطح پر پیش کرنا فی الواقعی ادب کی ایک تعریف سمجھ لی جائے تو اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ معروضی حقیقتیں بھی زندگی کی تحریک کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں جو عہد بہ عہد بدلتے ہوئے ادب میں منعکس ہوتی ہیں۔ ایرک فرام کا قول ہے:

> حقیقتاً انسان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں آتا جب تک کہ معاشرہ اس کی فطری جبلتوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔[۱]

یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کے موضوعات و مسائل، طرزِ فکر

[۱] فرائڈ کا نظریۂ ثقافت: نسیم شیشوفوز، بحوالہ سہ ماہی کراچی ص ۱۹۹

طرزِ احساس، اسالیب و اظہار کے سانچے بھی ہر عہد میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ مادی زندگی کے طریقِ پیداوار میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو سماجی نظام بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ رشتے بھی بدلتے ہیں اور زندگی کی قدروں اور افکار و خیالات میں بھی تبدیلی آجاتی ہے اور اسی سبب سے ادبی و فکری عمل بھی تغیر و تبدل سے ہم کنار ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی ادیب کی تخلیقات، اس کی فکر و آگہی اور جمالیات کا صحیح تجزیہ کر کے ہم بامعنی نتائج تک اسی وقت پہنچ سکتے ہیں جب ہمیں ان تاریخی و سماجی حالات اور ادبی و ثقافتی صورتِ حال کا بھی علم ہو جس کے تحت اس کے افکار و خیالات اور اس کی انفرادیت تشکیل پاتی ہے۔[۲]

ساحر کا عہد سیاسی و تہذیبی اور معاشی و معاشرتی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی معاشرہ برطانوی نوآبادیاتی نظام کے معاشی و معاشرتی اور تہذیبی تسلط کے جبر سے پیدا شدہ نئی معاشی، سیاسی اور سماجی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا پھر ہندوستان میں آزادی کی طویل جدوجہد کے بعد ایک بورژوا جمہوری ریاست کا قیام عمل میں آیا چنانچہ آزادی کے بعد جس سماجی نظام کی تعمیر ہوئی اس کی نوعیت نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام کی تھی ساتھ ہی ہندوستانی عوام کو بورژوا طبقے اور سیاسی لیڈروں نے اپنے مفادات کی خاطر مذہب کے نام پر تقسیم کر دیا۔ نفرت، دشمنی اور جنگ کے اسباب پیدا ہوئے۔ بے روزگاری، فرقہ پرستی، ظلم و ستم اور غربت و افلاس میں اضافہ ہوا۔ علم و فن، فہم و فراست اور ادب و ہنر بازار کی اشیاء بنے۔ مزدور اپنے عمل اور اپنی محنت سے بیگانہ ہوئے اور

۲۔ مضامینِ نو: خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۵۸

ادیب و فنکار اپنی تخلیقات سے:

جو تیری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک، تیرے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے تھے **فن کار**

غرضیکہ اس عہد میں اقتصادی اور سیاسی سطح پر ہی ہندوستانی معاشرہ تغیر و تبدل سے دوچار نہیں ہوا بلکہ افکار و خیالات، عقائد، اقدارِ حیات اور نظریاتی و نفسیاتی سطح پر بھی پیچیدہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انہی تبدیلیوں کے تحت ادب میں صنف و ہیئت کے نئے تجربے بھی سامنے آئے۔

ہندوستان میں برطانوی سامراج کا قیام نہ صرف ہندوستانی معاشرہ کے اقتصادی ڈھانچے اور عدالتی ضبط و نظم اور نظم و نسق کی تبدیلی کا موجب ہوا بلکہ انتظامیہ اور تعلیمی اداروں کے طریق کار پر اثر انداز ہوا۔ جاگیرداری اور زمین داری کی نئی شکل و صورت سامنے آئی جو زیادہ پیچیدہ اور سفاک تھی۔ نیز برطانوی معاشی پالیسی کا نتیجہ ہندوستانیوں کے انتہائی افلاس اور مفلوک الحالی کی شکل میں سامنے آیا اور تاجر بورژوازی، صنعت کار، سرمایہ دار بورژوازی کے ساتھ ہی ساتھ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کش مزدور طبقے نے جنم لیا۔ غرض کہ برطانوی عہدِ حکومت میں ہندوستانی معاشرہ ایک نئے معاشی و معاشرتی انقلاب سے دوچار ہوا۔ جس کی وجہ سے صدیوں پرانی جاگیردارانہ اقدار و روایات شکستہ ہوئیں۔ جدید تعلیم یافتہ

اور متوسط طبقے کی پرورش و پرداخت جن سماجی حالات میں ہوئی تھی اس کے زیرِ اثر وہ مغربی علوم، عقلیت پسندی، انسان دوستی، آزادی اور جمہور کے نظریے کی طرف مائل ہوئے۔ ڈاکٹر تاراچند اس طبقہ کے افراد کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہی لوگ ملک کے دانشور تھے جنھوں نے مشرق و مغرب کے بیچ رابطہ قائم کرنے کا کام کیا اور ہندوستانی عوام کی سیاسی قیادت کی۔ انہی کی آرزوئیں اور خواہشات، ہندستان کی آرزوئیں اور خواہشات بنیں۔ ۵۳

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ان بالیدہ سیاسی شعور کے مالک ہندستانیوں کے، جو ملک کی سیاسی اصلاح اور معاشی بہبود کے خواہاں تھے اور انگریز افسروں اور دانشوروں کے اپنے مفادات نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کو جنم دیا۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا ہندستانی عوام میں برطانوی حکومت کے خلاف اندر ہی اندر جو احتجاجی و باغیانہ جذبات جنم لے رہے ہیں ان کے مہذب اظہار کا موقع ملتا رہے ایسا نہ ہو کہ وہ تعلیم یافتہ ہندستانی نوجوانوں کی رہنمائی میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں۔

انیسویں صدی کے اختتام تک سیاسی و سماجی تحریک جس طبقہ کی قیادت میں تھی۔ وہ رہنما ہندستانیوں کے مطالبات کو عرض داشتوں، اصلاحات اور قرار دادوں کی شکل میں حکومت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت ہندستانی عوام اور مزدوروں اور کسانوں کی خواہشات کا احترام کرے گی اور ان کے مطالبات پورے ہوں گے۔ انھیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ وہ خود غرضی کو مٹاتے ضرور تھے لیکن صرف اپنی قوم سے۔ عالم انسانی سے نہیں۔ ان کا ایثار بھی اپنے ہی دائرے تک محدود تھا۔ سامراجی ذہنیت نے

۵۳ ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ ان انڈیا ص ۱۰۳

انھیں نیم دیوانہ بنا دیا تھا۔ ^۵۴^

بیسویں صدی کے آغاز تک مختلف سیاسی تحریکوں کے رہنماؤں کو اس بات کا عملی تجربہ ہو گیا تھا کہ ان کے مطالبات، خواہشات اور مفادات کو حکومت کسی بھی صورت میں پورا نہیں کر سکتی اس لیے عوام میں برطانوی حکومت کے استحصال پسند رویے، اس کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف احتجاجی جذبہ پیدا کرنا ہوگا اور ان کو قومیت اور حب الوطنی کا احساس دلانا ہوگا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ان حالات کو تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں:

> ...... ابتدائی دور میں بہت کم لوگ مکمل آزادی کے خواہش مند تھے۔ اس زمانے میں کانگریس کا بھی محض حقوق و رعایات کے لیے محضرناموں پر مطمئن ہونا اور یہ توقع کرنا کہ ایک منصف مزاج حکمراں کی طرح انگریز ہندستان کی معاشی اور سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر یہاں بھی حقوقِ انسانی کا تحفظ کرے گا ...... برطانوی سامراج کے چہرے کا یہ نقاب جو خود ہماری لگاہوں کا ہی بنا ہوا تھا، بیسویں صدی کے آغاز میں ہی تارتار ہو گیا اور ہماری سیاست نہ صرف محضرناموں کے سلسلۂ لامتناہی سے آزاد ہوئی بلکہ ساتھ ہی ساتھ انتہا پسند تحریکات نے بھی فروغ پایا۔ اردو شاعری میں چکبست اور حسرت موہانی کا بیک وقت وجود انہی دو انتہاؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ^۵۵^

۵۴ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر قمر رئیس ص ۸۶

۵۵ تأثر نہ کہ تنقید ص ۱۱۲

جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا اور قدوائی صاحب کے بیانات سے بھی ظاہر ہے۔ اس دور میں دانشوروں کا ایسا گروہ بھی سامنے آیا جو یہ سمجھتا تھا کہ فرنگی استعمار کی شفقت آمیز رہنمائی سے نہ تو ہندستانی عوام خوش حال ہو سکتے ہیں اور نہ ہندستانی معاشرہ ترقی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان رہنمایان قوم نے تحریک آزادی کا رخ سوراج کی طرف موڑ دیا اور "سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے" کا نعرہ پورے ملک میں گونج اٹھا۔ ان رہنماؤں کی جدوجہد اور کوششوں نے انگریزوں کے خلاف رائے عامہ کے لیے راہ ہموار کر دی اور غلامی کے احساس نے قومی اتحاد کی ضرورت کو شدید تر کر دیا[۵۶] دوسری طرف ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال کے خلاف ملک گیر سطح پر زبردست احتجاج ہوا۔ سرور جہان آبادی کی نظم ؎

آہ اے بنگال! آلام و مصائب کے شکار ؏

اسی احتجاجی رویے کی عکاس ہے۔ اسی زمانے میں اربندو گھوش کی قیادت میں پہلی بار سودیشی اور عدم تعاون کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہوئی جس کے نتیجہ میں انھیں تقریباً ایک سال تک جیل کی سزا بھگتنی پڑی۔

اسی اثنا میں آل انڈیا مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کا قیام بھی عمل میں آیا جو فرنگی استعمار کی کیا دلوں اور "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا نتیجہ تھا۔ ملک کے دانشور اور شعرائے اردو ان نکات کو سمجھتے تھے کہ ان دونوں متضاد خیال انجمنوں سے نہ صرف ملک و قوم کے اتحاد و یگانگت کو خطرہ لاحق ہوگا بلکہ فرقہ پرستی کو تقویت ملے گی چنانچہ ہندستان گیر سطح پر عوام کے دلوں میں جذبۂ اتحاد ابھارنے کی کوششیں کی گئیں تاکہ ملک کی سالمیت اور قومی تحریک کا تحفظ کیا جا سکے چنانچہ مسلم لیگ اور فرقہ پرستی کے خلاف

۵۶ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت: ڈاکٹر رام آسرا راز ص ۱۰۳

علامہ شبلی نعمانی نے صدائے احتجاج بلند کی اور اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں غیرتِ قومی کا احساس دلایا اور نہ صرف برطانوی سامراج پر سخت تنقید اور نکتہ چینی کی بلکہ اقوامِ ہند کو ان کی شاطرانہ چالوں سے آگاہ بھی کیا لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ مسلم لیگ کے خلاف شبلی نعمانی کا ردِعمل تو سامنے آیا لیکن ہندو مہاسبھا کے نظریاتی عمل کے خلاف کسی طرح کا بھی رویہ سامنے نہیں آیا۔ بجائے اس کے دوسرے شعراء کے یہاں قومی اتحاد، حب الوطنی کا فطری تصور اور اخلاقی و اصلاحی رویوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ان میں سرور جہان آبادی کی نظمیں شمعِ انجمن، قومی نوحہ، چکبست کی خاکِ ہند اور علامہ اقبال کی ترانۂ ہندی، ہندستانی بچوں کا قومی گیت اور نیا شوالہ قابلِ ذکر ہیں ان نظموں میں باہمی رواداری اور تصورِ اتحاد کا اخلاقی و اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

ہندستان میں ایک طرف یہ صورت حال تھی اور دوسری طرف یورپ میں پہلی جنگ عظیم کے خوفناک سائے لہرانے لگے۔ حکومت نے ہندستانیوں کو آزادی کے سبز باغ دکھا کر جنگ میں تعاون کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ اس جنگِ عظیم کے دوران قومی رہنماؤں کی کوششوں سے دو متضاد انجمنیں مسلم لیگ اور کانگریس ایک مرکز پر آگئیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں مسلمان اس کانگریس سے بغل گیر ہو چکے تھے جس کے سائے سے بھی وہ اب تک بدکتے تھے ..... ہندستانی سیاست کا یہ ایسا ہنگامی دور تھا جس میں جذبات کا لاوا بڑی شدت سے ابل رہا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کی ایسی مثال

۷ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت ص ۱۱۵

بھی شاید ہی کسی اور زمانے میں نظر آئے۔[۵۸]

دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعے مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار اور مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعہ عوام کے دلوں میں دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے کا کام کیا اور اپنی مساعی سے ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے ترکی کا جنگ میں جرمنی کی حمایت کرنے پر ایک مضمون ترکوں کی پسند کامریڈ میں شائع کیا اور معتوب ہوئے۔ اخبار ضبط کرلیا گیا اور ان کو ان کے بڑے بھائی شوکت علی سمیت نظر بند کر دیا گیا۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں مولانا محمد علی جوہر کو صدر منتخب کیا گیا اور علی برادران کی رہائی کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول کی تجویز پیش کی جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ حکومت نے اینی بیسنٹ کو گرفتار کرلیا لیکن چوں کہ ابھی جنگ جاری تھی اور انگریز ہندوستانی قائدین سے مدد لینے پر مجبور تھے چنانچہ انھیں اینی بیسنٹ اور دوسرے رہنمایانِ قوم کو رہا کرنا پڑا۔ اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مذکور ہوا کہ بیسویں صدی کے اوائل تک کی شاعری کا اندازِ نظر سیاسی کم اور اخلاقی زیادہ تھا لیکن تقسیمِ بنگال کے منصوبے اور بالخصوص ہوم رول تحریک سے اس کے سیاسی رنگ اور انقلابی آہنگ نمایاں ہونے لگتے ہیں جو قدم بہ قدم ہندوستان کی آزادی تک چلے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں ہوم رول تحریک کا سب سے واضح نمونہ چکبست لکھنوی کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران اور اس کے بعد سیاسی و سماجی سطح پر ہندوستانیوں کی حالت جو بھی رہی ہو بہرحال ناگفتہ بہ تھی۔ جنگِ عظیم کا خاتمہ برطانیہ کے اتحادی محاذ کی فتح کے ساتھ ختم ہوا۔ کہاں تو ہندوستان کی سیاسی

[۵۸] اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر ص ۴۱۶

جماعتوں نے قومی فلاح کے پیش نظر اس عالم گیر جنگ میں مراعات کی موہوم امید کے ساتھ برطانوی حکومت کو تعاون دیا تھا اور کہاں فرنگی سامراج نے بجائے مراعات دینے کے ہندستان پر اپنی سامراجی گرفت مضبوط کرنے کے لیے رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ اس ایکٹ نے حکومت کو وسیع اختیارات دے دیے کہ وہ جسے جب چاہے پکڑ لے اور بغیر مقدمہ چلائے اسے پابند سلاسل رکھے۔ [۵۹] دوسری طرف ترکوں کی شکست مقامات مقدسہ اور دارالخلافت (استنبول) پر اتحادیوں کا، اور سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ اور ترک آبادی کا قتل عام، ان دل خراش واقعات نے ہندستانی مسلمانوں کو آتش بداماں کر دیا۔ [۶۰] چنانچہ ردِ عمل کے طور پر علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور حسرت موہانی نے عدم تعاون کے لیے خلافت تحریک تشکیل دی اور ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی کی قیادت میں تحفظ خلافت اور سوراج کے حصول کی خاطر دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے خلاف پر امن بغاوت کا اعلان کر دیا۔ پھر ہندستان کی معاشی اور اقتصادی حالات کا عالم یہ تھا کہ ایک طرف جاگیردارانہ لوٹ کھسوٹ تھی جو کسانوں اور مزدوروں کی محنت کا ناجائز استعمال کر کے اپنے تعیش کا سامان مہیا کر رہے تھے اور سامراجی استحصال کے سبب ہندستانی عوام فاقہ کشی پر مجبور ہو رہے تھے اور دوسری طرف توہمات نے مزدوروں اور کسانوں کو مذہبی پیشواؤں کا غلام بنا رکھا تھا کیوں کہ "ان کا توکل، ان کی زندگی کا جمود اور ہر ظلم و جبر کو خاموشی سے سہنے کی عادت ان کی موہوم

[۵۹] یہ ایکٹ ہندستان کی آزادی کے ساتھ ختم نہیں ہوا بلکہ تاریخ کا حصہ بن کر آزاد ہندستان میں بھی موجود ہے۔ عصرِ حاضر کا TADA اسی کی ارتقائی شکل ہے۔

[۶۰] اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر ص ۲۵۴

مذہب پرستی کا اثر تھا۔[11] اس تاریخی حقیقت کی تلاش پریم چند کے افسانوں ناولوں اور جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی کی شاعری میں بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔ یہاں اس امر کا حوالہ ضروری ہے کہ ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں روس میں پرولتاریہ انقلاب کو زار شاہی پر فتح حاصل ہوئی اور پہلی بار دنیا میں اشتراکی نظام حکومت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ مارکس اور اینگلز کا فلسفۂ زندگی عملی اور تجرباتی صورت میں سامنے آیا۔ اس انقلاب نے ہندوستانی عوام میں خود اعتمادی پیدا کی اور سیاسی رہنماؤں کو عوام پر بھروسہ کرنا سکھایا۔ پرولتاری انقلاب کے اس کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> انقلاب روس کے بعد سے ساری دنیا میں آزادی کی جدوجہد نے ایک واضح شکل اختیار کر لی ہے اور آگے کی راہ روشن ہو گئی ہے۔ محنت کشوں اور عوام دوستوں کے لیے ایسا سرمایۂ نشاط اور ذریعۂ عمل ہے، جس سے وہ سوتے جاگتے شعور اور گرمی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ خود ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کے دوران میں طبقاتی کشمکش نے واضح راہیں تلاش کر لیں۔ یہاں تک کہ ناقص آزادی کی منزل جس قدر قریب آتی گئی، طبقاتی جدوجہد تیز تر ہوتی گئی۔[12]

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کا معاشی استحصال اور زیادہ بڑھ گیا۔

[11] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر قمر رئیس ص ۸۷

[12] بحوالہ ایشیائی بیداری اور اردو شعراء: اسلام بیگ چنگیزی ایم اے ص ۲۷

جنگ کے اخراجات کے سبب حکومتِ برطانیہ کی اقتصادی حالت اب پہلی جیسی نہ رہی تھی۔ اشیاء کی قیمتیں بڑھتی چلی گئیں اور ہندوستانی صنعت کو فائدہ پہنچانے اور ترقی دینے والی غیر ملکی درآمدات بند ہو گئیں۔ دوسری طرف معاشی حالات کی پیچیدگیوں کے سبب کسانوں اور مزدوروں میں بھی ہیجان اور اضطراب پیدا ہونے لگا تھا اس سلسلہ میں مولوی سید علی حسین 'زیبا' لکھتے ہیں:

> جنگِ عظیم سے آج تک [۱۳] ایک برقی رو ہندوستان میں دوڑ رہی ہے جس نے ملک کے گوشے گوشے میں نئی امیدیں، نئے ولولے اور نئی تحریکیں پیدا کرنا شروع کر دی ہیں۔ معاشرتی اور تمدنی تبدیلیاں جس برقی سرعت سے ہو رہی ہیں ...... ان تمام کا اثر ادب میں بھی نمایاں ہے۔ مستقل تصنیفوں کا فقدان۔ تالیف اور ترجموں کی کثرت اردو ہندی نزاع اور ادب کی نت نئی اسلوبی تبدیلیاں مجبور کر رہی ہیں کہ اس عہد کو "عہد اضطراب" کا خطاب دیا جائے۔ ہیجان و اضطراب اس عہد کی نمایاں خصوصیات ہیں پھر اس کو عہدِ اضطراب کے سوا اور کس نام سے یاد کیا جائے [۱۴]

یہی زمانہ تھا جب سارے ملک میں سیاسی بیداری کی تیز رو دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جلیاں والہ باغ کے خونی سانحے نے عام ہندوستانیوں کے دلوں میں سیاسی انقلاب کا جوش بھر دیا چنانچہ گاندھی جی کی اپیل پر سول نافرمانی

[۱۳] یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی ہے اس لیے یہاں "آج تک" سے مراد ۱۹۳۷ء تک ہی ہے۔
[۱۴] اردو ادب بیسویں صدی میں ص عرض ۲

کی مہم شروع ہوئی۔ اس میں مزدور بھی تھے طلبہ بھی، کسان بھی تھے اور وکلاء بھی لیکن چوری چورا کے حادثے سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے سر دست اس مہم کو موقوف کر دیا، انھوں نے چوری چورا کی بغاوت کی نہ صرف مذمت کی بلکہ اسے غیر انسانی فعل بھی قرار دیا۔ مجاہدین آزادی کے ایک گروہ نے اس خیال اور اقدام پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا اور عوام نے افسوس کا۔ اس سے قبل بھی احمد آباد کانگریس ۱۹۲۱ء میں پہلی بار مکمل آزادی کے حسرت موہانی کے ریزولیوشن کو گاندھی جی نے مسترد کیا تھا اور اسے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل قرار دیا تھا جس پر جواہر لعل نہرو کا سخت رویہ بھی سامنے آیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

> یہ چیز بالکل صاف ہے کہ ہمارے اکثر لیڈروں کے ذہن میں سوراج کے جو معنی تھے وہ آزادی سے بہت کم کوئی چیز تھی۔ گاندھی جی اس کے متعلق بہت مبہم تھے اور انھوں نے کبھی بھی اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی کہ لوگوں کے ذہن اس کے متعلق صاف ہوں۔ [۱۵]

بہرحال چوری چورا بغاوت کے بعد گاندھی جی نے سول نافرمانی ملتوی کر کے ہندوستانی سیاست کا رخ سوت کاتنے، نشہ بندی کرنے اور تعلیمی سرگرمیوں کے تعمیری پروگرام [۱۶] کی طرف موڑ دیا۔

۱۹۲۰ء میں انڈین ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام عمل میں آچکا تھا، اور ۱۹۲۵ء میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پڑی، اور رفتہ رفتہ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیمی قیادت کمیونسٹ ورکروں کے ہاتھوں میں آنے لگی۔ اس طرح

۱۵ میری کہانی ص ۷۶، بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۴
۱۶ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۴

مزدوروں نے بھی اپنے مطالبات حکومت کے سامنے رکھنے شروع کیے اور احتجاجی رویہ اختیار کیا۔ اس طرح ملک گیر سطح پر تحریکِ آزادی ایک نئی زندگی سے ہم کنار ہوئی۔ سائمن واپس جاؤ تحریکِ آزادی کے اسی بدلے ہوئے مزاج کی آئینہ دار ہے کیوں کہ ان تمام واقعات نے نہ صرف عوامی زندگی کو سیاسی محکومی کے معنی سمجھا دیے بلکہ انھوں نے انگریزوں سے بھی کسی طرح کی مراعات کی توقعات چھوڑ دیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سائمن کمیشن کے خلاف مردوں کے دوش بدوش مزدور عورتوں نے بھی مظاہرہ کیا۔

ہندستان میں یہ مختلف تنظیمیں روس میں اشتراکی نظام کے قیام سے اثر انداز تھیں۔ شاعری میں علامہ اقبال کی نظم خضرِ راہ میں اس کا استقلام دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ملکی اور بین الاقوامی مسائل اور سرمایہ دار اور محنت کش عوام کے باہمی تضادات بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں اور مستقبل کے امکانات بھی نمایاں ہوئے ہیں۔[۱۶] انھوں نے ایک ایسا انقلابی نظریہ (Dynamic outlook) اپنانے پر زور دیا جو دنیا کو بدل سکے۔ بنیادی طور پر وہ انسانیت کے علم بردار تھے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے انسانی اعمال (Humanaction) کو اعلیٰ نیکی (Prime Virtue) کا درجہ عطا کیا ان کا کہنا تھا کہ آدمی کو فطرت یا فطرت کی طاقتوں کے سامنے نہیں جھکنا چاہیے بلکہ جہدِ مسلسل (Constantactivity) سے کائنات کو مسخر کرنا چاہیے۔ ان کی نظروں میں اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں تھا کہ جد و جہد کیے بغیر حالات کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے۔[۱۷] چنانچہ افق روس سے پھوٹی ہوئی کرن ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچی تو تحریکِ آزادی کے بندھے ٹکے مفہوم کو اشتراکی خیالات سے منور کر گئی۔ دورۂ یورپ کے بعد جواہر لعل نہرو کے خیالات

۱۷؎ ہند اسلامی تہذیب مترجم لیاقت علی علیگ ص ۱۷

کی تبدیلی اسی اشتراکی تصور کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "۱۹۲۷ء میں کانگرس کا جو اجلاس مدراس میں ہوا اس میں بائیں بازو کا غلبہ تھا چوں کہ اس جلسے میں گاندھی جی شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے انقلاب پسندوں نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کر دیا اور بائیں بازو کے نوجوانوں کے سرگروہ جواہر لال نہرو اور سوبھاش چندر بوس کانگرس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ گاندھی جی نے مکمل آزادی کے ریزولیوشن کی خبر سنی تو سخت مذمت کی اور کہا کہ یہ فیصلہ جلد بازی میں بغیر سوچے سمجھے کیا گیا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگرس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تو گاندھی جی نے نہرو رپورٹ پیش کرائی اور جدوجہد کو ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔[۱۸] اس کے خلاف ملک گیر سطح پر سخت مظاہرے کیے گئے۔ مزدوروں اور کسانوں نے گاندھی جی کے اس فیصلہ کی نہ صرف مذمت کی بلکہ اس کے خلاف احتجاج بھی کیا نیز "پچاس ہزار مزدوروں نے کلکتہ کانگرس کے اجلاس کے وقت مظاہرہ کیا اور آزاد اشتراکی جمہوری ہندوستان کے نعرے لگائے۔[۱۹] حالات جو بھی رہے ہوں لیکن ان شواہد کی روشنی میں ایک بات صاف ہو جاتی ہے کہ مکمل آزادی کا ریزولیوشن گاندھی جی خود پیش کرنا چاہتے تھے کیوں کہ جنوبی افریقہ کی سامراجیت کے خلاف پُرامن جنگ کر چکے تھے اور انھیں اقوامِ ہند کی حالتِ زار اور استعماری قوتوں کے استبداد کا شدید احساس تھا بالآخر ۱۹۲۹ء کے لاہور اجلاس میں یہ ریزولیوشن پاس ہو گیا اور تحریکِ آزادی کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہوئیں۔

غرضیکہ بیسویں صدی کے ربع اول میں معاشی و معاشرتی سطح پر جو بیداری اور شعور پیدا ہوا وہ گاندھی جی، کمیونسٹ پارٹی اور انڈین ٹریڈ یونین

۱۸۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۵-۲۶

۱۹۔ ایضاً ایضاً ص ۲۶

کا رہونِ منت ہے کیوں کہ ایک طرف غیر ملکی کپڑوں اور ساز و سامان کے بائیکاٹ (سودیشی تحریک) نے سیاسی جدوجہد میں یہ انقلاب پیدا کیا کہ یہ تحریک ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی جس سے کسان اور مزدوروں کو مہاجنوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف صف آرا ہونے کا حوصلہ ملا اور دوسری طرف اشتراکی خیالات کے حامیوں کی قیادت میں ۱۹۲۷ء میں کھڑک پور ریلوے مزدوروں اور جمشید پور ٹاٹا اسٹیل ورکس کے ملازمین نے زبردست ہڑتالیں کیں۔

اس عہد میں سیاسی جدوجہد جن حالات سے دوچار ہوئی اور رہبرانِ ملک و قوم نے جن دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا کیا ان کے آثار بہت ہی واضح طور سے اردو ادب میں نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے کسانوں کے مختلف النوع مسائل اور عورتوں کی سماجی حد بندیوں کو جدوجہدِ آزادی کے پس منظر میں پیش کیا۔ پھر جلیاں والا باغ کا خونی منظر ہو یا سائمن کمیشن کی مخالفت، سول نافرمانی کی تحریک ہو اور تحریک خلافت یا پھر سوراج کے لیے جدوجہد، تقسیم بنگال کا مسئلہ ہو یا ہوم رول تحریک کا معاملہ، چکی کی مشقت ہو یا اتحاد قومی کا مسئلہ، اردو شاعروں نے جنگِ آزادی کے رجحانات اور تقاضوں کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا۔

چکبست کی خاکِ ہند، فریادِ قوم اور وطن کا راگ، حسرت موہانی کی جورِ غلامانِ وقت اور چکّی کی مشقت کے بعد مقامِ اشتراکیت ظفر علی خاں کی سائمن کمیشن اور مالوی جی کی سیوا میں نویدن اور مارشل لا سرور جہان آبادی کی بدنصیب بنگال، تلوک چند محروم کی سودیشی تحریک، محمد علی جوہر نذرِ سحر اور شرارِ جوہر، حفیظ جالندھری کی آزادی، ساغر نظامی کی ترانۂ شباب اور عہد، علی جواد زیدی کی حیات، جوش ملیح آبادی کی

سائمن کمیشن، آثارِ انقلاب کے بعد شکستِ زنداں کا خواب اور علامہ اقبال کی ترانۂ ہندی اور ہمالہ کے بعد خضرِ راہ، لینن (خدا کے حضور میں) اور فرمانِ خدا (فرشتوں کے نام) اور اختر ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، جمیل مظہری وغیرہ کی نظمیں اس سلسلے میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ظاہر ہے یہ فہرست کسی لحاظ سے مکمل نہیں ہے اور ممکن ہے اس عہد کی کچھ اہم نظمیں تحریر میں آنے سے رہ گئی ہوں لیکن میرا مقصد نہ تو شعراء کی فہرست مرتب کرنا ہے اور نہ تمام نظموں کا احاطہ کرنا بلکہ میرا مقصود ان رجحانات کی نشاندہی کرنا ہے جو عہدِ حاضر کی سیاسی صورتِ حال اور سماجی حالات کے زیرِ اثر تغیر و تبدل سے دوچار ہوئے کیوں کہ بقول فیض احمد فیض:

..... ۲۰ء سے ۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے .... اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدے کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا .... اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا ..... لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبتِ یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی۔ اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ [۲۰]

[۲۰] نسخہ ہائے وفا ص ۳۰۸

اس روشنی میں اگر ۱۹۲۵ء سے قبل اور پھر اس کے بعد کے دور (۱۹۲۰-۳۰) کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس عشرہ میں سیاسی و سماجی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس میں صرف ہیجانی جذبات کی ترجمانی اور وطن دوستی اور حریت پسندی کے خیالات کو ہی مرکزیت حاصل نہیں رہی ہے بلکہ ناساز گار حالات کو ساز گار بنانے، توہم پرستی سے چھٹکارا حاصل کرنے، مشترکہ تہذیبی اقدار کے تحفظ، جمہوریت نوازی، مزدوروں کی بے کسی، انگریزی سامراج اور سرمایہ دار و جاگیردار کے استحصالی رویے، فرسودہ اقدار و عقائد سے نجات پالینے، عقلیت پسندی اور نظام کہنہ و دیرینہ کی تبدیلی کا خیال بھی عام ہو رہا تھا۔" دوسری طرف پوری دنیا میں اشتراکیت اور عوامی انقلاب کی لہر نے نوجوانوں کو نیا سیاسی شعور دیا۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں اور عورتوں کی آزادی کے نظریے کو مقبولیت حاصل ہو چکی تھی خود انڈین نیشنل کانگریس میں قومی رہنماؤں کے دوش بدوش مسز اینی بیسنٹ اور سروجنی نائیڈو نے اپنی بے مثال قربانیوں سے مقبولیت حاصل کرلی تھی۔[۲۱]

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں طلبہ کی تنظیم "آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن (۱۹۳۶)"، کسانوں کی تنظیم "آل انڈیا کسان سبھا (۱۹۳۶)"، ادیبوں اور فنکاروں کی تنظیم "انجمن ترقی پسند مصنفین (۱۹۳۶)" اور "کانگریس سوشلسٹ پارٹی (۱۹۳۸)" کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح آزادی کی یہ تحریک طلبہ، کسانوں اور دانشوروں کی تحریک بھی بن گئی اور اس تحریک میں متوسط طبقہ کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان بھی شریک ہوئے۔

اس نوجوان طبقہ کے میلانِ طبع کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

[۲۱] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۷

> کالجوں میں پڑھنے والے نوجوان اب امریکہ کی آزادی، انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس پر کتابیں اور پمفلٹ پڑھ رہے تھے اور اب ابراہم لنکن گیری بالڈی، میزینی، روسو، والتیر، کارل مارکس اینگلز اور لینن کی سوانح عمریوں کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ ۲۳ے

پھر کانگریس کے اندر بھی جیسا کہ مذکور ہوا سوشلسٹ خیالات اور بائیں بازو کی فکر نمایاں ہونے لگی اور جواہر لعل نہرو اور سبھاش چندر بوس اس بات پر زور دینے لگے کہ کانگریس سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار دے۔ اسی زمانے اور اسی ماحول میں ساحر کی شعری شخصیت پروان چڑھی اور ہر چند کہ ان کی شاعری کا ابتدائی زمانہ رومانیت سے ہم آغوش اور ابتدائے عشق کے تحیر سے مملو تھا لیکن اس کا احساس تادیر قائم نہ رہ سکا کیوں کہ اول تو تقاضائے وقت کے سبب اور حالات و ماحول کی ستم ظریفیوں کے باعث رومانیت کی یہ خوشیاں تحریک آزادی اور انگریزی سامراج کے سماجی معاشی استحصال کے خلاف احتجاجی صداؤں میں محو بننے لگی تھیں دوسرے یہ کہ اس وقت تک مجاز لکھنوی کا مجموعۂ کلام آہنگ شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکا تھا، پھر فیض احمد فیض بھی رومانیت کے مخملیں حصار سے نکل کر اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا سے اور آگے کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں تک کا سفر طے کر چکے تھے، مزید برآں ترقی پسند تحریک ایک فعال سماجی اور تہذیبی و ادبی انجمن کی حیثیت سے ہندستان کے

۲۳ے اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۷

ادبی و سیاسی ماحول میں کارہائے نمایاں انجام دے رہی تھی۔ چنانچہ ان تنظیمات کے وجود میں آنے اور اشتراکی خیالات عام ہونے کا نتیجہ ایک طرف تو یہ نکلا کہ انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کا احساس زیادہ شدید ہوا اور دوسری طرف نسل اور ذات کے نام پر انسانی تفریق، مذہبی اختلافات اور طبقاتی تقسیم کے خلاف باقاعدہ جدوجہد شروع ہوئی اس طرح آزادی کا تصور اب محض انگریزی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے تک محدود نہ رہا بلکہ مساوی امکانات اور اقتصادی و معاشرتی ترقی کے تصورات بھی اس سے وابستہ ہوئے۔ اور بقول علی جواد زیدی اب جنگ کسی ملک کے خلاف نہیں رہ گئی بلکہ ایک نظام کے خلاف ہو گئی۔ اس کو مہاتما گاندھی کی "اہنسا" سے بھی سہارا ملا کیوں کہ مہاتما گاندھی نے بھی بار بار کہا کہ جنگ برطانوی عوام سے نہیں ہے بلکہ غلام بنانے والے نظام سے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب میں نعرہ بازی کم ہونے لگی اور اسباب و حالات کا اقتصادی جائزہ اور اس کے طبقاتی محرکات پر توجہ زیادہ مبذول ہونے لگی۔[۲۳]

اس زمانے میں شعراء کی جو نئی کھیپ آئی ان کا لب ولہجہ عام طور سے سیاسی کم اور استعماریت اور سامراجیت کے خلاف احتجاجی زیادہ تھا چنانچہ فیض احمد فیض کا ابتدائی کلام دیکھیں یا مجاز لکھنوی کے دور اول کی نظموں کا تجزیہ کریں تو انسان دوستی اور اجتماعی شعور کی نشاندہی تو کی جاسکتی ہے لیکن راست سیاست کی طرف میلان نظر نہیں آتا تاہم کچھ آگے چل کر ان شعراء نے اقتصادی اور معاشرتی مسائل کو آزادی کی خواہش اور غلامی اور ظلم کے خلاف اپنے باغیانہ اور انقلابی رویے سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان میں انقلاب اور نوجوان سے (مجاز لکھنوی)، چند روز اور مری جان (فیض احمد فیض)، جہان نو (مخدوم محی الدین)

۲۳؎ اردو میں قومی شاعری کے سو سال ص ۵۸

اے کاش (معین احسن جذبی)، ایک سوال، وقت کا ترانہ اور آزادی (علی سردار جعفری)، ساقی (جاں نثار اختر)، اور طرح نو، اشعار اور کچھ باتیں (ساحر لدھیانوی)، نیز ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، معین احسن جذبی اور جاں نثار اختر کی غزلوں کے علاوہ بیشتر ترقی پسند شاعروں نے اپنے سیاسی و سماجی اور معاشی و تہذیبی مسائل کو انقلابی آہنگ میں پیش کیا اور اشتراکی نظام کے قیام کی خواہشوں کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور نوجوانوں کے ذہن میں سوشلزم سے متعلق جو خیالات تھے اس کا نقشہ سجاد ظہیر نے یوں کھینچا ہے:

> سوشلزم کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے بنیادی سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کا محرک اور معمار محنت کش عوام کو قرار دیا ـــــ اس لیے کہ سماج میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے اس کی اقتصادی بنیادوں کو بدلنا ضروری ہے اور صرف وہی طبقے اور گروہ اس بنیادی تبدیلی کے پیدا کرنے میں حصہ لے سکتے ہیں جن کے مفاد اس تبدیلی سے وابستہ ہیں ـــــ گزشتہ تاریخ اور اسلاف کے کارناموں اور اپنے تہذیبی ورثے سے ہمیں ضرور سبق لینا چاہیے۔ ان کا پہلا سبق یہ ہے کہ قدیم اور گزرے ہوئے معاشی، سیاسی اور تہذیبی دور کو زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ـــــ اس سرمایہ کی حفاظت اور اس کا دانش مندانہ استعمال

ترقی پسندی کا لازمی عنصر ہے۔ تہذیب کی یہ اقدار
ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سمجھنے اور خوش گوار
بنانے میں مدد دیتی ہے۔ ۲۴ھ

یہ وہ دور تھا جب ملک میں سنجیدہ معاشی و معاشرتی اور سیاسی حالات کو ایک جدید اور رہبرانہ ماحول ملا۔ کسان اور مزدور مظالم کا شکار تھے اور کسانوں پر مال گزاری اور ٹیکسوں کا بوجھ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا بلکہ اب نا قابل برداشت بھی ہو چکا تھا پھر کسانوں اور مزدوروں کی تحریکات اور جدوجہد کو حکومت ہر طرح سے کچلنے پر آمادہ تھی۔ لہٰذا ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا کسان سبھا نے اپنی سیاسی قرارداد میں کہا:

اب وہ وقت آگیا ہے کہ کانگریس کو گلے لگانے
والی متحدہ طاقتیں ، ریاستی عوام، کسانوں اور مزدوروں
کی تنظیمیں آگے بڑھیں اور غلام آئین اور سامراجی
غلبہ کے خلاف حملہ شروع کریں تا کہ مکمل آزادی اور
ہندوستانی عوام کی ایک جمہوری ریاست کے حصول
کا باعث بنے اور کسانوں اور مزدوروں کی حکومت
قائم ہو سکے۔ ۲۵ھ

ابھی ایک جانب سیاسی قائدین عملی طور پر ملک و قوم کے تحفظ

۲۴ھ روشنائی ص ۸۸ - ۸۹
۲۵ھ بحوالہ پیزنٹ موومنٹ اِن انڈیا: سنیل سین ص ۹۶

اور انسانیت کی بقا کے لیے جدوجہد آزادی کو انقلابی کردار عطا کر رہے تھے اور دوسری جانب اردو شعراء اپنے افکار و اشعار کے ذریعہ قوم کے قلب کو گرمانے اور روح کو تڑپانے کے کارہائے نمایاں انجام دے رہے تھے۔ ملک میں خوش حالی اور اقبال مندی کا راج قائم کرنے کے لیے ان کی رگوں میں تجلیاں بھر رہے تھے کہ اسی اثنا میں نازی جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور بین الاقوامی سیاست نازک صورت حال اختیار کر گئی۔ برطانوی حکومت نے کانگریس اور دوسری عوامی تنظیموں اور مرکزی لیجس لیچر کی مرضی و مشورہ کے بغیر ہی اس دوسری جنگ عظیم میں ہندستان کی شمولیت کا اعلان کر دیا۔ فسطائی ہٹلر کا جرمن توسیعی جنون بڑھتا ہی گیا اور بیشتر مشرقی یورپ پر قبضہ کر لینے کے بعد ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو سوویت یونین پر حملہ آور ہوا لیکن روسی افواج جرمنی سرحد کو عبور کر گئیں اور جرمنی دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ساحر لدھیانوی کی نظم احساسِ کامراں میں فسطائیت کے انہی ناکام ارادوں کا مظاہرہ ہے:

سال ہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزمِ آزادیِ انساں، بہ ہزاراں جبروت
اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے مرضی و مشورہ کے بغیر جنگ میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا اعلان کر دیا لہٰذا اس کے خلاف کانگریسی وزارتوں نے زبردست احتجاج کیا۔ حکومت کے اندر بھی اس وقت شدید ہیجانی اور اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ اسی سلسلہ میں ترقی پسند مصنفین کی ہنگامی کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس میں اتحادی اقوام کی حمایت اور فاشسٹ قوتوں کی مخالفت سے متعلق قرارداد پیش کی گئی۔ اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں ترقی پسند مصنفین کے علاوہ "وہ ادیب بھی شریک ہوئے جو ادبی نظریات میں ترقی پسند تحریک سے متفق نہیں تھے۔ خاص طور پر حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کا گروپ جو ادب کی افادیت سے منکر تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپیگنڈہ کہتا تھا۔"[۲۶] اس کانفرنس میں ن۔م۔ راشد، میراجی، قیوم نظر مولانا صلاح الدین احمد، مولانا عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری کی شمولیت اس کی زندہ مثال ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے دانشوروں، ادیبوں اور فنکاروں کی ہمدردیاں ان ممالک کے عوام سے وابستہ ہوگئیں جو فسطائیت کے خلاف صف آرا تھے۔ اس ضمن میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور مجاز لکھنوی کے بیانات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں[۲۷]۔ دوسری طرف برطانوی حکومت نے ہندوستانی استمداد کی خاطر ایک نئی اسکیم کے تحت سر اسٹیفورڈ کرپس کو مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی کے پاس بھیجا لیکن اس اسکیم میں بھی برطانوی سامراج کا عناد پوشیدہ تھا، اس سلسلہ میں جوش ملیح آبادی کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" ایک طرف استعماری قوتوں پر

۲۶ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۶۳-۶۴

۲۷ تفصیلات کے لیے نیا ادب سہ ماہی بمبئی ۱۹۴۳ء شمارہ نمبر ۲ سے استنباط کیا جا سکتا ہے۔

شدید طنز کا احساس دلاتی ہے اور دوسری طرف ہندستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔ پھر مجاز لکھنوی کی اندھیری رات کا مسافر، شمیم کرہانی کی جگاوا، علی سردار جعفری کی جنگ اور انقلاب اور اٹھو، مخدوم محی الدین کی اندھیرا، ساغر نظامی کی ترانہ اور ساحر لدھیانوی کی طلوعِ اشتراکیت ہیں۔ جو اس پورے سیاسی وسماجی حالات کی عکاس بھی ہیں اور انقلاب کا پیغام بھی۔ اس دور کی شاعری کے بارے میں عبدالشکور ایم اے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> .....اس دور کی شاعری بجائے فرد سے مخاطب ہونے کے قوم یا سماج سے ہمکلام ہوتی ہے۔ بجائے انفرادی جذبات واحساسات بیان کرنے کے..... قومی مسائل، ملکی جذبات اور ملی احساسات پر حاوی رہی۔ ۲۸؎

۴۳-۱۹۴۲ء ہندستانی زندگی کا بدترین دور رہا ہے۔ اس ہنگامی دور میں ایک طرف ہندستان چھوڑ دو تحریک (Quit India Movement) نے ملک گیر سطح پر عوام میں سامراجی حکمرانوں کے خلاف غم و غصے اور نفرت کا جذبہ بھر دیا اور عوام نے نوآبادیاتی معیشت اور سامراجی غلبے سے نجات پانے کے لیے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ دوسری طرف اس زمانے میں بیشتر شعراء نے عملی طور پر عوامی جدوجہد میں حصہ لیا، چنانچہ ہندستان گیر پیمانے پر جہاں سیاسی قائدین اور تحریک آزادی کے

۲۸؎ دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء ص ۳۸

مجاہدین گرفتار کیے گئے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا وہیں متعدد شعراء بھی انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے اور قید کر لیے گئے۔ بقول اسلام بیگ چنگیزی:

> ______ اس دور کا شاعر صرف انقلاب کا مفکر اور مغنی نہیں رہا بلکہ اس نے خیالات کی بلندیوں سے نیچے اتر کر عوام کی جدوجہد میں عملی حصہ بھی لیا ....
> ______ یہ وہ دور ہے جب بسمل گورکھپوری شہید ہوئے۔ جب جوش، سردار جعفری، مخدوم اور انقلاب کے دوسرے شعراء جیل کی سلاخوں میں محدود کر دیے گئے۔ ۲۹؎

ساحر لدھیانوی کی نظم "لمحۂ غنیمت" اسی تحریک کا فکری اظہار اور حصولِ آزادی کی خاطر ستم خوردہ عوام کے لیے حوصلہ افزا پیغام ہے:

کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں آہنی ہی سہی
آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق! ۳۰؎

اس دور میں جو سیاسی اور معاشی صورتِ حال پیدا ہوئی اس نے

۲۹؎ ایشیائی بیداری اور اردو شعراء ص ۱۱۳

برطانوی حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ سارے ملک میں کسانوں، مزدوروں اور نوجوانوں نے شدید جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ اسی سال بنگال میں بدترین قحط بھی پڑا جس میں لاکھوں انسان بھوک سے مر گئے۔ فتح بنگال کے منصوبہ میں تو حکومت کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے پس پردہ اس شکست کا انتقام لے لیا نتیجتاً چند ماہ کے اندر تیس لاکھ لوگ اپنی زندگی گنوا بیٹھے۔ یہ تاریخ کا پہلا بدترین سانحہ تھا اور شاید کہ آخری بھی۔ "دیدۂ عبرت نگاہ کو یہ صدمہ تازیانے سے کم نہ تھا۔"[۳۰] لہٰذا اختر الایمان نے نظم "ایک سوال" لکھی، اختر انصاری نے "کلکتہ"، جگر مرادآبادی نے "بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں"، وامق جونپوری نے "بھوکا ہے بنگال"، سید مطلبی فریدآبادی نے "تیرے ہی بچے، تیرے ہی بالے" لکھی ان کے علاوہ علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین اور پنڈت آنند نرائن ملاّ کی نظمیں تاثیر کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ساحر لدھیانوی بھی اس حادثے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ قحطِ بنگال اسی وجہ سے سامراجیت کے خلاف شدید جذباتی اور احتجاجی رویہ کی انعکاس بن گئی ہے:

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے ۹

۳۰۔ تلوک چند محروم۔ حیات اور شاعری: ڈاکٹر محمد یوسف انصاری ص ۶۳

اس دور کی شاعری میں معاشی بدحالی اور اقتصادی ناہمواری کا اظہار الم انگیز اور رقت آمیز انداز کی جگہ مجاہدانہ للکار کی شکل اختیار کر گیا ہے نیز عوام کی بے بسی و بے چارگی کا احساس بھی شدید ہوا ہے لہٰذا شعرائے اردو نے صرف حالات و ماحول کی ترجمانی کو ہی سب کچھ نہیں سمجھا بلکہ تنقید و تبصرے کو اپنا فرض تصور کیا اور توکل و قناعت کے بجائے اپنا حق چھین لینے پر عوام کی بے حسی کو للکارا بھی ہے۔ ساحر کی نظم اجنبی محافظ میں یہ للکار صاف سنائی دیتی ہے جس میں عوام کی بے حسی پر اظہار تاسف بھی ہے اور سامراجی نظام سے برسرپیکار ہونے کا تلاطم آمیز پیغام بھی۔

دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہوتے تک مکمل آزادی کے مطالبہ میں شدت پیدا ہوتی گئی اور ہندستان کی جہدِ آزادی اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ گئی۔ دوسری طرف دوسری جنگِ عظیم نے انگریزوں کو سیاسی اور معاشی سطح پر اس قدر پست کر دیا تھا کہ انقلابیوں کو دبانے کا حوصلہ پیدا کرنا ان کے لیے ناممکن سا ہو گیا۔ ۱۹۴۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں بحریہ کے ہندستانی افسروں اور سپاہیوں نے بغاوت کر دی حکومت نے اس شورش کو کچلنے کے لیے فوج کا استعمال کیا چنانچہ لاتعداد ہندستانی جاں بحق ہوئے، عوام اُن جہازیوں کے تحفظ اور حمایت میں عام ہڑتالیں کیں۔ کانگریس کے وہ رہنما بھی جن کے رشتے قومی بورژوا طبقہ سے بہت زیادہ گہرے تھے محنت کشوں کے اس نئے سیلاب سے بہت گھبرائے ہوئے تھے چنانچہ انگریزوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا اور ان لوگوں نے اپنے اثر و شخصی رسوخ سے کام لے کر جہازیوں کی بغاوت کو ختم کرا دیا۔ بغاوت تو ختم ہو گئی لیکن اس نے ہندستانی جماعتوں کے باہمی خلیج کو اور وسعت دے دی۔ اس کے

۳۱ھ ایشیائی بیداری اور اردو شعراء: اسلام بیگ چنگیزی ص ۱۴۳

خلاف شعرائے اردو نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ علی سردار جعفری نے اپنی نظم ملاحوں کی بغاوت میں قومی رہنماؤں کے اس رویہ کی شدید طنزیہ لہجے میں مذمت کی اور ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم یہ کس کا لہو ہے کے ذریعہ رہبرانِ ملک و قوم کی رہبری پر سوالیہ نشان لگایا:

اے رہبر ملک و قوم ذرا
آنکھیں تو اٹھا، نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں، ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

کیا قوم و وطن کی جے گا کر، مرتے ہوئے راہی غنڈے تھے؟
جو دیش کا پرچم لے کے اٹھے، وہ شوخ سپاہی غنڈے تھے؟
جو بارِ غلامی سہہ نہ سکے، وہ مجرمِ شاہی غنڈے تھے؟

اگست ۱۹۴۶ء اور اس کے بعد ملک میں وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جو مسلم لیگ اور کانگریس کے باہمی اور اندرونی اختلافات کا نتیجہ تھے۔ بہ الفاظ دیگر "ہندو فرقہ پرستی جو ہماری قومی جدوجہد کے ساتھ ایک عرصہ تک پروان چڑھتی رہی، ایک منزل پر آ کر قومی نمائندہ جماعت کانگریس سے باہر آ گئی اور اس نے مسلم لیگ کی طرح ہندو مہاسبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ جیسی فاشسٹ قوتوں جیسی شکل اختیار کر لی۔"[۳۲] اور جیسا کہ اولین

۳۲؎ ایشیائی بیداری اور اردو شعراء ص ۱۳۲

صفحات میں ہی ذکر کیا گیا اس فرقہ پرستی کی بنیاد تقسیم بنگال کے زمانے میں ہی پڑ چکی تھی جب مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا جیسی انتشار پسند جماعتیں منظر عام پر آئی تھیں۔ فرق یہ رہا کہ مسلم لیگ کی نشو و نما ایک علاحدہ جماعت کی حیثیت سے ہوئی اور ہندو مہا سبھا کانگریس کے اندر ہی پروان چڑھتی رہی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی تصنیف ڈسکوری آف انڈیا میں لکھتے ہیں:

> ہماری جدوجہد آزادی پر ہندوؤں کا غلبہ تھا اور یہ تحریک ایک ہندوانہ نقطۂ نظر کی حامل تھی، اس لیے مسلمانوں کے دماغ میں ایک الجھن پیدا ہوئی اور مسلمانوں کی فرقہ پرستی اسی الجھن کے رد عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۳۳

بہر حال، انگریزوں نے جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہندستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا مگر فرقہ وارانہ منافرت کے اس ماحول اور ہندستان کی بدلتی ہوئی صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر انھیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی ہندستان کو آزاد کرنا پڑا۔ انگریزوں نے ہندستان چھوڑ تو دیا مگر اسے دو حصوں میں منقسم کرنے کی سازش میں کامیاب ہو گئے۔ شعراء نے اپنے اپنے فکر و خیال کے مطابق یا تو آزادی کا خیر مقدم کیا یا پھر آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکنے کی صورت میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا کیوں کہ ان کے خیال میں یہ بورژوا جمہوری نظام کا دور آغاز تھا۔

بحوالہ
۳۳/ ایشیائی بیداری اور اردو شعراء ص ۱۳۱-۱۳۲

اور یہ احساس ان شعراء کے یہاں زیادہ شدید تھا جو سماجی تبدیلی کی بے پناہ خواہش رکھتے تھے۔ ان میں فیض احمد فیض کی صبح آزادی علی سردار جعفری کی فریب، جاں نثار اختر کی تاب سخن اور ساحر لدھیانوی کی مفاہمت خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ ہندستان کی تاریخ کا عبرت ناک اور بدترین دن بھی ثابت ہوا کیوں کہ تقسیم ملک کے بعد فرقہ وارانہ منافرت اور عصبیت کا ایسا طوفان امڈا کہ ہزارہا لوگ اس کا شکار ہو گئے۔ ساحر لدھیانوی کی نظم آج فرقہ وارانہ فسادات کے شدید ترین احساس اور شکستہ و پامال آرزوؤں کی مظہر ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ آزاد ہندستان میں بھی جاری رہا اور رجعت پسند، بنیاد پرست اور فرقہ پرست طاقتیں دن بدن مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ معاشی و معاشرتی اور تہذیبی استحصال اور عدم مساوات میں اضافہ ہوا۔ بے روزگاری، افلاس، ذات پات کی تفریق اور مذہبی امتیازات کے مسائل ملک اور قوم کی قسمت بن گئے۔

جشن غالب اور گاندھی ہو یا غالب ہو نظموں میں ساحر نے فرقہ وارانہ فسادات، تنگ نظری اور عصبیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور نام نہاد سیاسی اور سماجی رہنماؤں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے نیز اردو زبان کے تئیں حکمراں طبقے اور اردو دشمن افراد کی سازش کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی آزاد ہندستان میں زبان والسان کے حقوق کی پامالی پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> جہدِ آزادی کے دوران فرقہ پرستی کا
> رجحان کچھ تو یہاں کی احیا پرست قوتوں کی
> بدولت اور کچھ سامراجی حکومت کی پالیسی کے
> سبب اس طرح بڑھا کہ تقسیمِ ہند کا باعث
> ہوا، اس کا المناک نتیجہ یہ ہوا کہ خود اردو
> فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو گئی۔ ۳۴؎

ہر چند کہ آزادی کے بعد عورتوں کو معاشی پیداوار، تہذیبی، انتظامی عدالتی اور تعلیمی اداروں میں مردوں کے مساوی کام کرنے کے حقوق اور فرائض حاصل ہوئے لیکن ایسے معاشرہ میں جس کی بنیاد ذاتی ملکیت اور دولت پر قائم ہو، عورت دوجہتی استحصال کا شکار ہوئی۔

اسی طرح ہندستان کو تین بار جنگوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ۱۹۶۲ء میں چین کے ساتھ جنگ ہوئی اور ۱۹۶۵ء میں مغربی سرحد تک پاکستان سے مڈبھیڑ ہوئی جس کا اختتام معاہدۂ تاشقند پر ہوا۔ ساحر کی نظم اے شریف انسانو! ہندو پاک جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی۔ اور معاہدۂ تاشقند پر نشر کی گئی۔ یہ نظم پر امن زندگی کی امین بھی ہے اور انسانی زندگی کے تحفظ کی پاس دار بھی۔

ساحر اپنے ابتدائی دنوں سے ہی جنگ اور خوں ریزی کی مخالفت کرتے آئے ہیں ان کی طویل ترین ڈرامائی نظم پرچھائیاں جو ۱۹۵۵ء کی تخلیق ہے امنِ عالم کے سلسلے کی شاید سب سے خوبصورت

۳۴؎ تاثر نہ کہ تنقید ص ۱۱۵

نظم ہے۔ باوجودیکہ ۱۹۷۱ء میں ایک بار پھر ہند پاک جنگ ہوئی۔ انجام کار پاکستان سے اس کا مشرقی حصہ الگ ہو گیا اور ایک نئی مملکت بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔

غرضیکہ آزاد ہندستان کے لیے جس معاشرہ اور سیاسی نظام کا خواب محنت کش طبقوں، نوجوانوں، فنکاروں اور دانشوروں نے دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آزادی کے بعد جس معاشرہ کی تشکیل ہوئی وہ نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ تھا۔ بورژوا جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ اقتصادی اور معیشتی بحران نے لاتعداد سماجی، تہذیبی، سیاسی اور معاشی مسائل کو جنم دیا اور ملک کی یکجہتی اور سالمیت کے لیے خطرہ پیدا کیا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مغربی افکار و خیالات اور جدید تعلیم کے فروغ نے اگرچہ غور و فکر کی راہیں کھول دیں لیکن بیسویں صدی کا یہ پورا زمانہ شکست و ریخت کا ہی زمانہ رہا اور افسوس ناک امر یہ ہے کہ پسماندہ اور متوسط طبقہ آج بھی اتنا ہی شکست خوردہ ہے جتنا پہلے تھا۔